Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کو جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

جس روز دوبارہ کلاسیں شروع ہوئیں وہ مجھے لائبریری سے نکلتی ہوئی مل گئی۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے بات نہ کروں گا، لیکن وہ مجھے ایسے ملی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

"ارے سلطان ڈیر کیسے رہے اتنے دنوں؟ میں تمہیں یاد کرتی رہی، سب دوستوں کو یاد کرتی رہی۔ بڑے موٹے تازے، لال سرخ نظر آ رہے ہو۔ برف باری تمہیں راس آ گئی ہے، ہے نا؟" اس نے پرانے بے تکلف، بے راز لہجے میں کہا۔

"بڑی شدید برف باری ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آج ہم ڈریگن میں کھانا کھائیں گے۔ میں بڑی امیر ہو رہی ہوں آج کل فکر نہ کرو۔ پھر باتیں کریں گے۔ بہت سی۔ میں تمہیں اتنی باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دے میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ میرا سارا غم و غصہ آنِ واحد میں غائب ہو چکا تھا۔ ڈفل کوٹ اور سرخ رنگ کے سکارف میں وہ اس قدر دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں اسے قریب سے دیکھ کر مسکرا دیا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ جو لڑکے اسے کیمپس بھر پر بدنام کرتے پھرتے تھے پہلی فرصت میں اس کے ارد گرد جمع ہو کر دانت نکالنے لگتے تھے۔

اُسی شام ہم ڈریگن کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ صبح کا ہلکا پن غائب ہو چکا تھا اور میری طبیعت کی کدورت پھر اُوپر آ گئی تھی۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں ہم دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہ کی تھی۔ اب ہم کافی کا انتظار کر رہے تھے۔

"تمہیں میرا خط ملا تھا؟" آخر اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"پھر بھی خفا ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں ــــ تمہارا کرسمس کیسے گزرا؟"

"بڑے مزے میں ــــ"

"تمہاری ماں تم سے جھگڑنے کے لیے ہمیشہ کرسمس کے موقعے کو منتخب کرتی ہے۔"

"سلطان،" وہ سانس روک کر بولی، "تمہارا خیال ہے میں نے جھوٹ بولا ہے؟"

"اگر جھوٹ بھی بولا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"کمینے ــــ" اُس نے چیخ کر کہا۔ پھر مجھے آنکھیں جھپکتا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگی۔ "بس؟ اپنا آخری وار بھی کر لیا نا تم نے! تم لوگ بڑی جلدی اپنا سرمایہ ختم کر دیتے ہو۔ غلطی میری تھی، لیکن تم معاف بھی کر سکتے تھے۔"

"بلانکا تم ــــ"

"انسانوں سے بہت زیادہ وابستگی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

"میری بات سُنو!" میں آگے جھک کر چلایا، "تم نہیں سمجھتیں۔ تم ــــ"

"شش ــــ" ہونٹوں پر انگلی رکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس کے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اُس نے پیسے دینے چاہے۔ میں نے بداخلاقی سے اُس کا ہاتھ پیچھے ہٹا کر بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

گرم گرم ریسٹوران میں سے نکل کر یخ بستہ ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں پر آ کر لگے اور برف کے پھوہے ہماری پلکوں پر اٹکنے لگے۔ برف کے طوفان میں سر اور منہ لپیٹے ہم دیر تک خاموشی سے سڑکوں اور گلیوں میں چلتے رہے۔ شہر کے اس حصے سے میں ناواقف تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چپکے سے میرے ساتھ چلے آؤ۔" اُس نے سرو کے پودے پر سے برف اُٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

آخر وہ ایک دروازے کے آگے پہنچ کر رک گئی۔ دو بار گھنٹی دینے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ بلانکا کو دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر فوراً الگ ہو کر میری طرف بڑھی۔

"میرا نام اینا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "سب لوگ تہہ خانے میں ہیں۔" وہ مڑ کر بلانکا سے بولی۔ اس نے تنگ موری کی سیاہ پتلون اور ڈھیلی ڈھالی گرے رنگ کی سویٹر پہن رکھی تھی اور اس کے بھورے رنگ کے لمبے لمبے سیدھے بال تھے اور اس نے سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے بددلی سے دیکھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ہم تہہ خانے میں اُتر گئے۔ یہ بہت چھوٹا سا کمرہ تھا اور سگریٹ اور سگار کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اچھو لگا۔ جب میں سنبھلا تو دو چار لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ بلانکا سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نگاہ ڈالی اور میرا سر چکرانے لگا۔ ایک ہاتھ دیوار پر رکھ کر میں نے دوسری نظر ڈالی۔ کمرے میں دنیا کی ہر شئے جو دستیاب ہو سکتی تھی موجود تھی: ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور موسیقی کا ساز و سامان، کتابیں، بیئر کی خالی بوتلیں اور سگرٹوں کے ٹن میلے کپڑے اور پرانے جوتے اور پھٹی ہوئی جرابیں اور استعمال شدہ ٹائلٹ کا سامان اور ٹوٹے ہوئے ٹینس ریکٹ اور برتن جن میں دنوں تک بغیر دھوئے کھانا کھایا جاتا رہا تھا اور کتنے ہی الم غلم کے انبار چھت تک لگے تھے۔ چھوٹے سے فرش کی ایک ایک انچ جگہ اسی سامان سے اور لوگوں سے بھری تھی اور لوگ — نوجوان لڑکے، جن کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور جنہوں نے موٹی موٹی بند گلے کی سویٹریں اور ڈھیلی ڈھالی پتلونیں اور غیر پالش شدہ جوتے پہن رکھے تھے اور بے انتہا غلیظ دکھائی دے رہے تھے، جو موٹی موٹی عینکوں کے نیچے سے اُلوؤں کی طرح دانا، غیر شخصی نگاہوں سے نو واردوں کو دیکھتے تھے اور پھر بڑے بے تکلف، بڑے پیارے انداز میں ہنستے تھے۔ اور لڑکیاں تھیں، جنہوں نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو ہیر ڈریسر کے ہاتھوں سے ناآشنا تھے اور جو میزوں پر بیٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہی تھیں۔ ایک کونے میں فرش پر ایک لڑکا بیٹھا بانگو ڈرم، بجا رہا تھا اور دوسرا ایک کاغذ پر سے نظم پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ تیسرا لڑکا خاموش بیٹھا غور سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک چوتھا ان کی طرف پشت کیے رگیں پھلا پھلا کر ٹرمپٹ (بگل) بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وسط میں ایک بڑی سی میز پر پانچ چھ لڑکے لڑکیاں بیٹھے کوئی بحث کر رہے تھے اور بیئر پی رہے تھے۔ تیسری دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک لڑکی اکیلی بیٹھی جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ سگریٹ اس کی اُنگلیوں میں جل چکا تھا۔ دوسرے کونے میں سب کی طرف پیٹھ کیے باٹرن بیٹھا پیانو بجا رہا تھا۔ کمرے میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ بلانکا میز پر بحث کرتے ہوئے لوگوں میں شامل تھی اور ایک لڑکا بار بار اسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سارے منظر نے میرے اندر شدید بددلی کی کیفیت پیدا کر دی۔ دیوار پر سے ہاتھ اٹھا کر میں باٹرن کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"بیتھوون —" وہ سر اٹھا کر بولا، "موسیقی کا پیغمبر بیتھوون۔"

"ہوں۔" میں نے دانائی سے سر ہلایا۔

"میں نے 'مون لائٹ سوناٹا' ختم کر لیا۔ یہ پانچویں سمفنی ہے۔ بیتھوون کی موسیقی کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اپنی 'کال' سن لی ہے۔"

"ہوں۔" میں نے دوبارہ سر ہلایا۔

"کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے میاں! کچھ منہ سے بولو۔ تم نے اپنی کال سن لی ہے؟"

"نہیں۔" میں بوکھلا کر ہنسا، "مجھے تو بلانکا یہاں لے آئی ہے۔"

"جین میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتی۔" اُس نے اُداسی سے کہا، "تم بھی بلانکا کا یہاں آنا پسند نہیں کرتے ہو گے۔ مگر تم لوگ نہیں سمجھتے۔ تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہو۔ تم چھوٹے چھوٹے لوگ ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اس کی طرف دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس کی داڑھی غلیظ تھی۔

اسی اثناء میں کئی نوجوانوں نے آکر تعارف کیے۔ بغیر اپنے بے تکلف لہجے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی اور لوٹ گئے۔ جب دوبارہ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بلانکا اور وہ نوجوان، جو اُسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا، ٹرمپٹ اور بانگو ڈرم کی دھن پر ٹیپ ڈانس کر رہے تھے اور باقی سب ان کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تالی کی تال دے رہے تھے۔ بلانکا والہانہ طور پر ہنس رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ اکیلی بیٹھی ہوئی لڑکی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھی۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے رہا تھا۔ میں اور باترن جا کر تالی بجانے والوں میں شامل ہو گئے۔

جب دو گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو خوش و خرم تھے۔ تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل کر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گلی ویران پڑی تھی۔ بلانکا نے دیوار کی تاریکی میں دونوں بازو پھیلائے اور بولی:

"یہ سب میرے دوست ہیں۔ میں ساری دنیا میں شامل ہوں۔ ہم سب ہیں ــــ"

برف باری رک گئی تھی۔ ہوا رک گئی تھی۔ سردی غائب ہو چکی تھی۔ خوش گوار موسم میں ہم نے اپنے بھاری کوٹوں کے بٹن کھول دیے۔ دکانیں دیر ہوئی بند ہو چکی تھیں۔ شوکیسوں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ہم ان میں دیکھتے ہوئے چلنے لگے۔

"یہ سفید فر دیکھ رہے ہو۔" وہ کہہ رہی تھی، "یہ اصل نایاب 'مِنک' ہے۔ آج سے دو سال بعد میں کسی لکھ پتی سے شادی کرنے والی ہوں۔ پھر یہ ساری فریں میرے کلوزٹ میں ہوں گی اور میں ناک ہوا میں اٹھا کر تمہارے ایسے لوگوں کے پاس سے شوں کر کے نکل جایا کروں گی۔ تم اگر دو سال کے اندر اندر لکھ پتی بن گئے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔" وہ ہنسی، "یہ سیزان کے سیب ہیں۔ مجھے بھوک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگ رہی ہے۔ چھ ہزار سات سو بیاسی۔ اتنے سیب اس نے پینٹ کیے تھے۔ پتا نہیں کھائے کتنے ہوں گے؟"

ہر چند قدم پر اس کی اُبلتی ہوئی نوجوان، اداس، دانا، گہری، جذباتی، مختصر، ہلکی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ کیمپس تک پہنچتے پہنچتے ہم ہانپ گئے، اتنی چڑھائی چڑھنی پڑتی تھی۔ یہاں پر تقریباً حبس ہو رہا تھا۔ ہم نے کوٹ اتار کر اس کے ہوسٹل کی سیڑھیوں پر رکھے اور ان پر بیٹھ گئے۔ رات میں تازہ گری ہوئی برف کی بُو تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس نے کہنا شروع کیا: "سلطان میں اکثر جھوٹ بولتی ہوں لیکن اس معاملے میں میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میری ماں کا جغرافیے کا علم بہت محدود ہے۔ جب میں نے اس سے تمہارے بارے میں کہا تو وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آج تک میں نے کبھی کسی کو اس طرح اپنے گھر مدعو نہیں کیا۔ لیکن شام کو میرے باپ سے اس نے اس کا ذکر کیا تو اس نے اسے بتایا کہ پاکستان ایشیا میں ہے۔ اس سے سارا جھگڑا شروع ہوا۔"

"سارا جھگڑا؟"

"ہاں۔ اسے پتا چل گیا کہ تم — یعنی تم —"

"میں کیا —؟"

"کہ تم —" وہ پھر رک گئی۔

"کالا ہوں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

اُس نے ایک لمبا سانس چھوڑا۔ "کہ تم ایشین ہو۔ اسی رات کو اس نے پھر مجھے فون کیا۔ میں تمہیں ساتھ لانے پر بضد رہی۔ اس نے کہا کہ اس کو تمہارے رنگ سے یا نسل سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ یہ میرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہے۔ کیونکہ اس سے دوسرے لڑکے — میرے ہم عمر لڑکے — متعصب ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائیں گے اور یہ میرے مستقبل کے لیے بُرا ثابت ہو سکتا ہے — میں نے فون بند کر دیا۔ صبح اُٹھ کر میں پہلی گاڑی سے چلی گئی۔ یہ ساری بات تھی۔ تم کو میں اس جھگڑے میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"تو کیا واقعی —" کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا، "دوسرے لڑکے — گورے لڑکے —؟"

"ہاں۔ یہ لوگ ظاہر نہیں کرتے مگر بری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر ایک خاموش معاہدے کے تحت اس لڑکی کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا پہلے ہو چکا ہے۔"

"اور تم؟"

"میں؟ ارے پاگل آدمی تم نے سُنا نہیں۔ میں تو ساری دنیا میں شامل ہوں۔"

"پھر بھی تم —"

اُس نے اپنی بات جاری رکھی: "ہم سب ایک دوسرے کی زندگیوں میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی خاطر میں آج تمہارے ساتھ شہر گئی تھی۔ یہاں سے جاتے ہوئے اور شہر میں پھرتے ہوئے ہم دونوں کو بیسیوں لڑکوں نے دیکھا ہے، وہ لڑکے مجھ پر جان دیتے ہیں، وہی جو مجھے بدنام کرتے رہتے ہیں، جو میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں کس کی پرواکرتی ہوں! میں آزادی چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہے گا تو دن دھاڑے جا کر کسی سیاہ فام آدمی سے شادی کر لوں گی۔ یہ لوگ مجھے بدنام ہی کریں گے نا۔ میں اس کی عادی ہوں۔ پھر یہ لوگ بھول جائیں گے، لوگ بھول جاتے ہیں — اسی خاطر میں آج تمہیں اُن لوگوں کے درمیان لے گئی تھی جو سوسائٹی سے نکالے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی نے جن کو ملعون قرار دیا ہے، جن کی مذمت میں اخباروں کے ورق کے ورق سیاہ کیے گئے ہیں۔ جو غلیظ ہیں اور آوارہ ہیں اور غیر منظم زندگیاں بسر کرتے ہیں اور لامذہب ہیں۔ لیکن پاگل آدمی —" وہ آہستہ سے ہنسی، "تم نے دیکھا ہے؟ یہی لوگ ہیں جو زندگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اس کی اصل بنیادی شکل میں دیکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، جنہوں نے اپنے اُوپر سے تہذیب کے ہر خول کو اتار پھینکا ہے تاکہ زندگی کو ننگا کر سکیں، جنہوں نے اپنی سمت خود متعین کرنے کی خاطر پرانی سمتوں کا احساس ہی کھو دیا ہے۔ جو زندگی کی نیکی اور محبت اور سادگی میں یقین رکھتے ہیں لیکن مذہب نے جنہیں بددل کر دیا ہے، کیونکہ بیسویں صدی میں دنیا کے اس سب سے تہذیب یافتہ ملک میں ایک چرچ سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے چرچ سے تعلق رکھنے والے کی دکان سے ضرورت کی کوئی چیز بھی نہیں خرید سکتا، کیونکہ ایک مذہب دوسرے مذہب سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ یہ لوگ کسی قوم یا مذہب یا نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہ محض انسان ہیں جن کے پاس ان کا دماغ ہے جو انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا، جو انہیں دکھ دیتا رہتا ہے۔ یہ غلط ہیں لیکن اپنی تمام تر غلاظت اور بے ترتیبی اور کنفیوژن میں سے خوبصورتی اور محبت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ خوبصورتی کا تصور پیدا ہونا یا نہ ہونا محض اتفاق کی بات ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کون اس کی تلاش میں نکلتا ہے، کون اتنی جرأت کرتا ہے — یہ لوگ آزاد ہیں اور آزادی چاہتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں۔ میں کوئی بندش قبول نہیں کر سکتی۔ میں کسی سے دلچسپی نہیں رکھتی، کسی کی پروا نہیں کرتی، صرف آزادی چاہتی ہوں، آزادی —" وہ پرندے کی طرح بازو ہوا میں پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ "آزادی میری خواہش ہے۔"

پھر وہ اچانک بیٹھ گئی۔ "سلطان سنو۔ میرا کمرہ دیکھنا چاہتے ہو؟ چلو تمہیں دکھاؤں — چلو —" وہ بولی۔

"مگر — کیسے؟"

"اس وقت سب سو رہے ہیں۔ میرے پاس باہر کے دروازے کی چابی ہے۔ ہم چپکے سے اوپر چڑھ جائیں گے۔ تم یہیں بیٹھو، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ جب اشارہ کروں تو آجانا —"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے مزید اجازت لیے بغیر چپکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں مبہوت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے دروازے میں آ کر اشارہ کیا تو میں بے خودی میں اپنا کوٹ وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ اندر گرم پانی کے پائپوں کی ہلکی ہلکی حرارت تھی۔ ہم چوروں کی طرح دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ وہیں پر دوہری ہو گئی۔ چند منٹ تک اس کا سارا جسم خاموش ہنسی کے اثر سے ہلتا رہا۔ اس وقت وہ مجھے ایک ننھی سی چمکیلی آنکھوں والی بچی کی طرح لگی جو سب بڑوں کے سو جانے کے بعد اپنے ہم عمر بچے کے ساتھ کیک چرانے کا پروگرام بنا رہی ہو۔

"اس وقت اگر کسی کو تمہاری موجودگی کا علم ہو جائے تو ہم دونوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔" وہ بولی، "مجھے ان باتوں میں بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے، بڑے ایڈونچر کا۔ تم دوسرے شخص ہو جو میرے کمرے میں آئے ہو۔ پہلے میرو آیا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ اس کا کمرہ ہر لڑکی کے کمرے کی طرح تھا، مگر سخت بے ترتیب! صرف دیواروں پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے، سیاہ رنگ کے، بدہیئت، پرانی دیمک زدہ لکڑی کے ٹکڑے دھاگوں کے ساتھ کیلوں سے ٹنگے ہوئے تھے۔

"یہ 'ڈرفٹ ووڈ' ہے۔ میں ڈرفٹ ووڈ جمع کرتی ہوں۔ تم بھی کرتے ہو؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔"

"یہ تم لے لو۔" اس نے ایک لکڑی دیوار سے اتار کر میری طرف بڑھائی۔ "لے لو، یہ میری سب سے قیمتی لکڑی ہے۔ یہ میں نے پارسال اطلانتک میں سے پکڑی تھی۔ اور یہ ——" اس نے دوسری لکڑی اتار دی، "میری سب سے خوبصورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لکڑی ہے۔ یہ بھی تم لے لو۔"

پھر وہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے چومو۔"

اُس کی آنکھوں سے تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ میں نے جھک کر آہستہ سے اُس کے ہونٹوں کے کناروں کو چوما۔ پھر میرے دماغ میں آگ لگ گئی۔ دونوں لکڑیاں فرش پر پھینک کر میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

"بلانکا ــــ" میں چیخا، "میں بچہ نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے کھلونے نہیں چاہئیں۔ میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں۔ مجھے تم سے ــــ تم سے عشق ہے۔ تم ــــ"

میری بلند ہوتی ہوئی آواز کو سن کر وہ چند لمحے کے لیے سکتے میں آ گئی۔ پھر تیزی سے لپک کر اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول کر مجھے باہر دھکیل دیا۔

بند دروازے کے پیچھے مجھے اس کے تیز تیز سانس لینے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔

پنجوں کے بل بھاگتا ہوا میں سیڑھیاں اُترا اور باہر نکل آیا۔ برف گرنی پھر شروع ہو گئی تھی۔ خاموش سفید رات میں میں اپنے کوٹ کے پاس سُن کھڑا دل کے دھڑکنے کی آواز سُنتا رہا۔

برف باری شدید ہو گئی۔ در و دیوار، شجر اشجار اور حدِ نظر تک زمین و آسمان دودھیا سفید رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں دن بھر لیبارٹری میں اور رات گئے تک اپنے کمرے میں کافی پیتا اور کام کرتا رہتا تھا۔ میرا وظیفہ صرف ایک ٹرم کا تھا اور انہی چند مہینوں میں مجھے اپنا تھیسس مکمل کرنا تھا۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر میری میزوں پر، کرسیوں پر اور صندوقوں پر پڑے رہتے تھے۔ اس سرد، بے رنگ اور بے بُو دنیا میں یوں لگتا تھا کہ پڑھنا اور کام کرنا انسان کی آخری جائے پناہ رہ گئی ہے۔ اور پھر دفعتاً ایسا ہوا کہ اس سرد، بے رنگ دنیا میں بلانکا کے لیے میرا جذبہ کافور ہونے لگا۔ کبھی کبھی لیبارٹری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کام کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر میں اسے صاف طور پر محسوس کرتا، دل ہی دل میں اس پر متعجب ہوتا، پھر اطمینان اور پشیمانی کا گہرا سانس لیتا اور خوردبین پر جھک جاتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر میں پھر جذباتی طور پر مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

اب بھی ہم اکثر ملتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اب بھی میں، باٹرن، جین اور بلانکا 'ڈریگن' میں اپنی مخصوص میز کے گرد جمع ہوتے، یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں غل مچاتے اور اکٹھے 'سکی انگ' کے لیے جاتے، مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جلتے ہوئے جذبے کی ساری بے چینی اور سارا درد اب گزر چکا تھا اور اس کی جگہ ہلکی سی پشیمانی اور گہرا اطمینان اور دائمی رفاقت کا احساس رہ گیا تھا۔ اب ہم برابر کی سطح پر آ گئے تھے اور اس پر خوش تھے۔ اس رات والے واقعے کا ذکر کسی نے کبھی نہ کیا۔ باٹرن پر برابر دیوانگی کا وہ دور گزر چکا تھا اور اس نے داڑھی ہی صاف کروا دی تھی۔ لیکن موسیقی میں اس کی دلچسپی بڑا سنجیدہ اور بالغ جذبہ بن چکی تھی۔ وہ گہرے شعور کے ساتھ اب اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جین کے ساتھ اب اس کی مکمل صلح تھی۔ بلانکا اسی طرح حسین، متلون مزاج اور بڑی عزیز دوست تھی۔

اس کے باوجود اُس کی دلکشی اور اس کے تلون اور اس کی ساری شخصیت کے معمے کے بارے میں ایک گہرا استعجاب، گہرا تجسس میرے دل میں راہ پا گیا تھا، جس کی ہلکی ہلکی آنچ ہر وقت اندر سلگتی رہتی تھی اور کبھی مجھے پورے طور پر اس سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی۔ گو اس کے بعد میں نے شعوری طور پر اس سلسلے میں کبھی کوئی کوشش نہ کی۔

لیکن پھر بہار کا موسم آیا اور برف ساری پگھل گئی اور نئی کونپلوں کے رنگ فضا میں بکھر گئے۔ سالانہ 'پرام' ڈانس سے تین ہفتے قبل مجھ پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا اور مجھے کیمپس ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک روز بلانکا مجھے دیکھنے آئی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے ہاتھوں میں سفید پھولوں کے گلدستے تھے۔ "یہ بہار کے پہلے پھول ہیں"۔ اُس نے کہا، "تمہارے لیے اُگے ہیں۔ انہیں چومو۔" میں نے ہنس کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھولوں کو تکیے کے برابر رکھ دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر روزانہ کے قصے سُنانے لگی۔ میں نے پانچ روز سے شیو نہیں کیا تھا اور خاصا کمزور محسوس کر رہا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے میں بیچ بیچ میں آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک بار میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ خاموش بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سلطان کب واپس جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آج سے پورے ایک ماہ بعد۔"

"تمہارا تھیسس مکمل ہو گیا؟"

"تقریباً۔"

"سلطان،" وہ آگے جُھک کر بیٹھ گئی، "میں 'پرام' ڈانس پر تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"اگر تم چاہتی ہو تو۔" میں نے کہا۔

"میری ایک بات مانو۔"

"کہو۔"

"تم داڑھی رکھ لو۔"

میں ہنسنے لگا۔

"ہنسو نہیں پاگل آدمی، میری بات سنو۔ بس اسے بڑھنے دو چند روز تک۔ پھر اسے ترشوا لینا۔ وہ جیسے بائرن نے ترشوائی تھی۔ پھر — پھر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ اور اس روز میں بھی تمہیں ایک سرپرائز دوں گی۔"

"تم بھی داڑھی رکھو گی۔"

"کچھ نہ کچھ بہر حال ہو گا۔ تمہیں بڑی اچھی لگے گی، یقین کرو۔ رکھو گے نا؟ مان لو —" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا: "میری خاطر —

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہو ہاں۔"

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کچھ اس کی خاطر، کچھ پرانے وقتوں کی خاطر 'ہاں' کر دی۔

بیماری سے اُٹھتے اُٹھتے مجھے دو ہفتے لگ گئے۔ دسویں روز جب وہ مجھے دیکھنے کو آئی تو سفید پھولوں کا گلدستہ بستر پہ رکھ کر اس نے جیب سے قینچی نکالی اور انہماک کے ساتھ میری داڑھی تراشنے لگی۔ میں اُس کی مشاقیِ فن پہ حیران رہ گیا۔

ڈانس سے ایک روز پہلے وہ مجھے شہر لے گئی۔ 'ڈریگن' میں آئس کریم کھانے اور کافی پینے کے بعد ہم واپس ہوئے۔ رستے میں وہ ہیئر ڈریسر کی دکان کے سامنے رک گئی۔

"دیکھو یہ ہمارا ہیئر ڈریسر جان ہے۔ اس سے سب طے ہو چکا ہے۔ یہ تمہاری داڑھی کو خوبصورتی سے تراش دے گا اور اسے سنہرا رنگ دے دے گا۔" اس نے کہا، "اب دیکھو ضد مت کرنا، ورنہ میں یہیں پر بیٹھ کر رونے لگوں گی۔"

جان کے شیشے میں دیکھتے دیکھتے میری شکل تبدیل ہو گئی۔

"اب تم بالکل جارج پنجم لگتے ہو۔" وہ میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"شکریہ ــــ" میں نے سنجیدہ جواب دیا اور پیسے دے کر باہر نکل آیا۔

جب بلانکا باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ لیکن میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کے سر پر سفید چمکدار جھلملاتی ہوئی چاندی کے تار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بال چھوٹی عمر کے جیسی لڑکوں کی طرح کٹوائے تھے اور 'سلور گرے' میں رنگائے ہوئے تھے۔ اپنی حجامت سے کم عمر لڑکا، بالوں کے رنگ سے بڑھیا اور اپنے حسین چہرے سے نوجوان عورت دکھائی دیتی تھی۔ سب کچھ ملا کر دیکھنے پر انسان چکرا جاتا تھا۔ میری بوکھلاہٹ کو دیکھ کر اس نے مضبوطی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے سکارف سر پر باندھ لیا۔

ناچ کی شام کو ہم دونوں کے گرد میلہ رہا۔ اس کو ان گنت لڑکوں اور مجھے ان گنت لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنا پڑا۔ شام جب اپنے عروج پر تھی تو میں اور وہ اچانک آمنے سامنے آگئے۔ ناچ کی گرمی اور شباب اور ایک دوسرے کی ہیئت کے مضحکے کے باوجود ہم نے اس وقت کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کی کہ ہم سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کی بجائے ہم نے تقریباً ایک ساتھ نظریں نیچے گرا دیں اور یوں جیسے پہلے سے کیے گئے فیصلے پر عمل کر رہے ہوں، باہر نکل آئے۔ برآمدے کی بتیاں قصداً بجھا دی گئی تھیں۔ نیم تاریکی میں آہنی ریلنگ جھلملا رہی تھی۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آٹھ ہزار میل۔"

وہ ریلنگ پر جھکی رہی۔ ہال میں بتیاں ایک ایک کر کے بجھائی جانے لگیں، حتیٰ کہ صرف چھت کا وسطی فانوس جلتا رہ گیا۔ نیچے وی آنا کا والز ہو رہا تھا۔ 'بلیو ڈینیوب' کی مانوس، آہستہ آہستہ اُٹھنے والی، قریب آنے والی، دور جانے والی، روح میں داخل ہونے والی، پگھلا دینے والی کیف آگیں موسیقی ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔

"سلطان۔" اُس نے کہا، "ہم زندگی میں ہزاروں میل طے کریں گے، لیکن یہ آٹھ ہزار میل شاید کبھی طے نہ کر پائیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد ہم شہر کے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ 'ڈریگن' میں چند منٹ بیٹھنے کے بعد وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے کئی ایک جگہیں بیٹھنے کے لیے تجویز کیں لیکن وہ چلتی گئی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ جیسے بیٹھنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو تھکا کر چور کر دینا چاہتی ہو۔ مگر پھر وہ ایک آدھ کھلے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ "آئس ہاکی" کا سٹیڈیم تھا، جہاں پر دو روز پہلے ایک مشہور میچ ہو چکا تھا، جس میں یونیورسٹی کے تماشائی لڑکوں نے بڑی دھاندلی کی تھی اور قصہ ڈین جنکنز تک پہنچا تھا۔ ہم نیم تاریک گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہمارے چاروں طرف پچیس ہزار نشستیں خالی پڑی تھیں اور اس عظیم سٹیڈیم میں اس وقت صرف ایک وسطی لائیٹ جل رہی تھی جو نیچے برف کی چمکتی ہوئی سفید سطح پر روشنی کا چھوٹا سا گول دائرہ بناتی تھی۔ چند مزدور پھاوڑوں کی مدد سے فالتو برف کو سمیٹ رہے تھے اور اگلے کھیل کے لیے برف کا میدان ہموار کر رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور کام میں مصروف رہے۔ ہم اَن گنت سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سب سے پچھلی تاریک رو میں جا کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف سے خالی سٹیڈیم کی بیکراں وسعت عود کر آ رہی تھی اور بیچ میں ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے ہم دونوں کی چھوٹی چھوٹی، دھندلی، اکلوتی شکلیں بے ٹھکانا فقیروں کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس جگہ، جہاں پر ہم نے ہمیشہ روشنیوں کا اور انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا، اچھلتا کودتا، ناچتا اور شور کرتا ہوا پُر رونق سمندر دیکھا تھا، اب ہم خاموش اور اکیلے بیٹھے تھے اور ایک عظیم اور خوفناک احساسِ تنہائی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ دور نیچے تین بڈھے بدحال مزدور پھاوڑوں سے برف کی سطح ہموار کرتے ہوئے روشنی کے دائرے میں داخل ہو رہے، روشنی کے دائرے سے نکل رہے تھے اور بیچ بیچ میں بھاری، اُداس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔

آخر بلا نکانے، جو نیچے روشنی کے گیلے، چمکدار دائرے میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، خفیف جھرجھری لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"میرو نے یہاں ہاکی کھیلنا سیکھا تھا۔" اس نے کہا۔

"میرو کو تم بہت یاد کرتی ہو!" میرا لہجہ حسد کے کسی جذبے سے حیرت انگیز طور پر پاک تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس سے میرا بھائی چارہ تھا۔"

"یہ تمہارا میرے کچھ پلے نہیں پڑا۔" میں نے کہا، "مجھ سے بھی ہے اور باترن سے بھی ہے اور ساری دنیا سے ہے۔"

"تم غلط سمجھے ہو۔" وہ بولی، "اور کسی سے نہیں تھا۔ صرف اس سے تھا۔"

"کوئی بڑا خاص آدمی ہوگا یہ مسٹر میرو۔"

وہ روشنی کے دائرے میں دیکھتی رہی۔ "میرو ہسپانوی خانہ جنگی کی اولاد تھا۔ اس کے ماں باپ فرانکو کی فوجوں کے خلاف لڑتے ہوئے سول وار کے دوران ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ان دنوں وہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لیے لیے پھرتے تھے۔ تم کہو گے: محبت کرنے کی کسے فرصت تھی؟ لیکن محبت کرنے کے لیے کسے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے؟ میرو ایک پہاڑی غار میں پیدا ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد وہ دونوں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ میرو کو ایک بوڑھے سپاہی نے پالا۔ جب میرو پندرہ برس کا ہوا تو بوڑھا سپاہی بھی مر گیا، لیکن مرنے سے پہلے وہ میرو کو سب کچھ بتا گیا۔ میرو بڑی اٹل شخصیت کا مالک تھا۔ 'میں اپنے ماضی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا،' اُس نے مجھے بتایا، 'اور نہ میری خواہش ہے۔ میں بہت بڑا جرنلسٹ بنوں گا۔' ان دنوں میں اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی، وہ میری زندگی میں پہلا اور آخری مرد تھا۔ میں اس سے بہت خوف زدہ رہتی تھی، کیونکہ وہ مجھے تباہ کر دینے پر قادر تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا: 'زندگی میں اگر خوش رہنا ہے تو دنیا سے بھائی چارہ کرو پاگل لڑکی۔ باقی سب بے کار ہے۔ سب بھول جاؤ۔' میں نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ اپنی دیوانگی پر قابو پانے لگی۔ لیکن میرے پاس اس کا ذہن نہ تھا۔ وہ اپنے حادثے کو بھول گیا تھا۔ میں اپنے حادثے کو نہیں بھول سکی۔"

"میرو کو؟" میں نے پوچھا۔

وہ اُداسی سے ہنسی۔ "میرو کو کون یاد کرتا ہے۔ وہ تو محض ایک سمبل تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سمبل؟"

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔

دفعتاً میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔

یکساں، اُداس آواز میں اس نے اپنی بات جاری رکھی: "تین سال میں ان کے ہاں تین لڑکے ہوئے۔ پھر میری ماں بیمار پڑ گئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ مزید بچے کی پیدائش ناممکن ہے۔ وہ گھر میں ایک بیٹی بھی چاہتے تھے۔ وہ خوش حال لوگ تھے۔ چنانچہ وہ 'ہوم' (لاوارث بچوں کی رہائش گاہ کو عموماً محض 'ہوم' کہہ کر پکارا جاتا ہے) پہنچے اور سب سے پیاری بچی کو منتخب کر کے گھر لے آئے۔ میں سیکنڈری سکول میں تھی جب مجھے یہ سب کچھ بتایا گیا۔ اس وقت میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی بچی کی حیثیت سے گھر بھر میں ممتاز تھی اور بھائیوں نے میری عادت کافی حد تک بگاڑ رکھی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ پیسے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے اور میرے ساتھ سب سے زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا تھا۔ پھر ایک روز جب میرے بھائی باہر گئے ہوئے تھے میرے باپ نے مجھے پاس بلایا۔ میری ماں بھی قریب بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ زرد تھا۔ میرے باپ نے کہا: 'اب تم سمجھ دار ہو گئی ہو اور ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے۔' اُس نے مجھے بتایا، اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا، لیکن ایک بات وہ چھپا گیا۔ اُس نے کہا کہ میرے اصل ماں باپ دو غریب انگریز میاں بیوی تھے جو کچھ روز پہلے انگلستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور میری پیدائش کے فوراً بعد ٹریفک کے ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ میں اُداس ہو گئی۔ مجھے افسردہ دیکھ کر اس نے کہا: 'دنیا میں سب بچوں کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہوتی ہے، لیکن تم وہ خاص الخاص آدمی ہو جسے منتخب کیا گیا ہے، سینکڑوں بچوں میں سے، تمہیں خوش ہونا چاہیے۔' میں خوش ہو گئی۔ ان کا فرض پورا ہو گیا۔ وہ اس بات کو بھول گئے، مگر میں نہ بھول سکی۔ یہ نہیں کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ اس دن سے لے کر آج تک میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک درجن ماہرانِ نفسیات کے پاس جا چکی ہوں۔ آخر مجھے پتا چلا ہے کہ ماہرانِ نفسیات اگر احمق نہیں تو خوش فہم ضرور ہوتے ہیں۔ اس روز ان دونوں میاں بیوی نے، جو میرے ماں باپ ہیں، میرے دل میں ایک خوف بٹھا دیا تھا جسے آج تک کوئی نہیں نکال سکا۔ وہ مجھ پر اسی طرح مہربان رہے جس طرح ہمیشہ سے تھے اور میرے بھائی اسی طرح مجھے لاڈ پیار سے بگاڑتے رہے اور میں اسی طرح کنبے کا خاص الخاص فرد بنی رہی — لیکن اس روز کے بعد میں نے ایک بار بھی یقین کے ساتھ کبھی نہ سوچا کہ میں وہی لڑکی ہوں جو سولہ سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہتی آئی ہوں۔ میرے ماں باپ نے کبھی میری داخلی زندگی کو جاننے کی کوشش نہ کی۔ انہیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میرے باپ کے روزانہ کام کے اوقات بڑھتے گئے، آٹھ سے دس اور دس سے بارہ گھنٹے ہوئے اس لیے کہ ہم خوش حال سے خوش حال تر ہو سکیں، اس لیے کہ ہمارے ہمسایوں کے پاس بڑھیا فرنیچر تھا اور ہم ان سے بازی لے جانے پر مصر تھے، صرف اس بناء پر کہ ہم ان کے بازو میں رہتے تھے۔ مذہب ہمسائے کے ساتھ محبت کرنا سکھاتا ہے نا؟ ہم ان سے محبت کرنے میں مصروف تھے، کہ اس ملک میں یہی طریقہ محبت کرنے کا رائج ہے۔ پھر انہوں نے بڑی عمدہ کار خریدی اور میرے باپ کی زندگی کا اولین مقصد ان کی ایسی کار خریدنا بن گیا۔ میرا باپ بڑا کامیاب شخص ہے۔ ایک دن آیا کہ ہمارے پاس وہ سب کچھ تھا جو ہمارے ہمسائے کے پاس تھا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ پھر میرے باپ نے مکان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ اب ہم اپنے تمام ہمسایوں میں سب سے زیادہ خوش حال تھے اور یہ لوگ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ہم ان میں رہتے چلے جائیں۔ ہم نئے مکان میں آ گئے جو بڑے فیشن ایبل علاقے میں تھا۔ میرے باپ نے آرام دہ مکان میں ذرا دیر رک کر سستانے کی بجائے اپنے کام کے اوقات مزید بڑھا دیے۔ اب وہ آدھی آدھی رات تک گھر پر کام کرتا رہتا تھا، اس لیے کہ اپنے نئے ہمسایوں میں ہم سب سے زیادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدحال تھے اور ان سے ٹکر لینے پر مصر تھے، محض اس بناء پر کہ ہم ان کے بازو میں رہتے تھے۔ میں تمہیں الف لیلیٰ کی کہانی نہیں سُنا رہی، یہ ہمارے ملک کا دستور ہے۔ یہاں فرد تباہ ہو جاتا ہے اور سوسائٹی مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ سال کے آخر پر اعداد و شمار شائع ہوتے ہیں اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ آج ہم دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک میں رہ رہے ہیں اور فی کس دنیا میں سب سے زیادہ کما رہے ہیں اور اپنے جسموں کو دنیا کی عمدہ ترین غذا پر پال رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور پتا نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ہماری روحوں کو دن بھر میں کتنی کیلوریز کی ضرورت ہے، اس کے اعداد و شمار ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

"معاف کرنا، میں بھٹک گئی تھی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے ماں باپ کو ذرا فرصت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے گھر کو نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا اور اپنے بچوں کو دنیا کے خوش قسمت بچوں میں تصور کرتے تھے اور وہ شاید غلطی پر بھی نہ تھے۔ لیکن میں اب بدل چکی تھی۔ جہاں میں پہلے ہر وقت ناک چڑھائے رہتی تھی وہاں میں اب اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو گہری احسان مندی اور خوف سے دیکھنے لگی تھی، جیسے کہ میں اس گھر میں چور دروازے سے داخل ہو کر غاصبانہ قبضہ جما بیٹھی تھی اور یہ لوگ مجبور ہو گئے تھے اور مجھے مستقل برداشت کیے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے وہ مجھے بہلانے کے بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے وہاں اب میں نے ہر چھوٹی موٹی بات میں اُنہیں خوش کرنے کے راستے تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ میں موقع بے موقع مسخرے پن کی حرکتیں کرتی اور وہ قہقہے لگاتے اور میں دل میں مطمئن ہو جاتی، آزردہ ہو جاتی، پریشان ہو جاتی۔ میں یک لخت جوان ہو گئی تھی، شاید بوڑھی ہو گئی تھی۔ اپنی نئی زندگی میں عظیم داخلی پریشاں حالی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے اپنے اوپر تک بالکل غیر فطری شخصیت کا خول چڑھانا پڑا۔ اپنی شرمندگی کو، اپنی خفت کو، اپنے احساسِ جرم کو چھپانے کے لیے! کسی کو فرصت نہ تھی یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاننے کی کہ مجھ میں یہ تبدیلی کیوں کر آئی۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ سب کا فرض پورا ہو چکا تھا۔ صرف میرا فرض باقی رہتا تھا۔

"پھر ایک روز رابرٹ کو میں نے اپنا ہم راز بنا لیا۔ وہ سیکنڈری کے آخری سال میں میرا ہم جماعت اور گہرا دوست تھا۔ ایک دن میں اور وہ جھوٹ موٹ کے میاں اور بیوی بن کر 'ہوم' جا پہنچے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم کوئی بچہ گود لینا چاہتے ہیں اور درخواست دینے سے پہلے انکوائری کے لیے آئے ہیں۔ ہم وہاں بے مقصد گھومتے اور ان کی فائلیں دیکھتے رہے۔ پھر میں نے وہاں کی سب سے بوڑھی میٹرن کو ایک طرف لے جا کر اپنے بچپن کی تصویر دکھائی اور پوچھا کہ کیا وہ اس بچی کو جانتی ہے؟ اس نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا اور میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بولی: 'تم اس لڑکی کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو؟' میں نے اس سے کہا کہ یہ لڑکی میری بچپن کی ساتھی تھی اور ایک سال کا عرصہ ہوا کہ مر چکی ہے۔ یہ سن کر وہ بدحواس ہو گئی اور کہنے لگی کہ قانونی طور پر 'ہوم' کو اس کی اطلاع ہونا چاہیے تھی جو کہ نہیں کی گئی۔ وہ اپنی فائلوں کی طرف دوڑی، لیکن جاتے جاتے اپنی بدحواسی میں مجھے بتا گئی کہ یہ لڑکی سترہ سال ہوئے اس کے سامنے ہی لائی گئی تھی اور کہ جاڑوں کی اُس صبح کو یہ لڑکی شہر سے باہر باغ کے ایک بنچ پر ٹھٹھرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کی ماں کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔ باپ قانونی طور پر شاید کوئی تھا ہی نہیں۔

"اسی شام میٹرن ہمارے گھر آئی اور میرا پول کھل گیا۔ مجھے کھلے بندوں مجرم قرار دیا گیا اور ایک ہفتے تک میرا باہر نکلنا اور گھر والوں سے میری بول چال بند کر دی گئی۔ لیکن اب مجھے پروا نہ تھی۔ میرے دل میں نفرت اور جرم کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایسی آگ جو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے بھی جاتی ہے اور زندہ رہنے کا اور جی بھر کر نفرت کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتی ہے۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان اب ایک جھوٹ جنم لے چکا تھا، جس کے بل پر ہم